افاداتِ فراہیؒ

ترجمہ: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

قرآن مجید کا طرزِ استدلال

[ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نادر مضمون جس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، مولانا عبد اللہ عمادی مرحوم کے عربی رسالہ البیان لکھنؤ میں ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ کے شمارہ ۸ (جلد ۵) میں "محاجۃ الوحی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ علامہ کے قیام کراچی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ علامہ فراہی کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا اس طرح یہ مضمون انتقال سے کم از کم پچیس سال قبل لکھا گیا تھا۔ مضمون کے مطالعہ سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ علامہ کی نہایت اہم غیر مطبوعہ اور ناتمام کتاب "حجج القرآن" کی کوئی فصل ہوگی جس کا مسودہ دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڈھ میں محفوظ ہے

ترجمے پر مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اپنی مصروفیات اور خرابی صحت کے باوجود بھرپور نظر ثانی نہ فرمائی ہوتی تو یہ اشاعت کے قابل نہ ہوتا۔ ہم اسے علی گڑھ (بھارت) کے ششماہی علمی مجلہ "علوم القرآن" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں]

(۱)

نبی امت کے لیے باپ کی مانند ہوتا ہے، وہ امت پر غایت درجہ شفیق اور علم میں سب پر فائق ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ امت کو ایک عام آدمی کی طرح مخاطب نہیں کرتا۔ اور جب قوم اپنی حماقت، تکبر اور ہٹ دھرمی کے سبب اس کی دعوت کا انکار کرتی ہے تو اسے بے حد رنج ہوتا ہے۔ نبی کا حال اس شفیق باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنے مریض بیٹے کو دوا دینا چاہتا ہے اور بیٹا دوا لینے کے بجائے باپ سے بحث کرتا ہے اور اس کی نصیحت پر توجہ نہیں کرتا۔ باپ کبھی نرمی سے سمجھاتا ہے، اور کبھی طرح دے جاتا ہے، کہ شاید خود باز آجائے۔ ایک بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو باپ بحث و تردید کے دلدادہ مناظرہ باز کی طرح اس بات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل پیش کرتا ہے کہ شاید وہ کارگر ہو۔ اگر تمہیں کسی باپ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو کہ وہ کس شفقت و محبت سے اپنے ضدی بیٹے کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی مصلح کو کہ وہ کیسی ہمدردی اور دلسوزی سے اپنی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے

تو کسی قدر اندازہ ہوگا کہ نبی کا رویہ اپنی امت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

(۲)

اگر نبی کی تعلیمات تک عقل کی رسائی از خود ممکن ہوتی تو انبیاء کی ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی باتیں خلاف عقل اور بعید از عقل ہوتیں تو اوّلاً اس پر کم عقلوں کے سوا جو کسی معجزہ کو دیکھ کر صرف تقلید میں ایمان لائے ہوں، کوئی ایمان نہ لاتا۔ ثانیاً ان تعلیمات کو بقاء اور رسوخ حاصل نہ ہوتا۔ ثالثاً معجزہ پیش کرنے سے قبل نبی قوم کو قصوروار نہ ٹھہراتا۔ لیکن جب واقعہ یہ ہے کہ معجزہ پیش کرنے سے قبل قصوروار ٹھہرایا گیا، اور انبیاء کی تعلیمات پر اصحاب عقل ایمان لائے، نیز ان ارباب دانش کے دلوں میں انھیں رسوخ ملا جنھیں تقلید سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تو معلوم ہوا کہ انبیاء کی تعلیمات عقل کو اپیل کرتی تھیں، چنانچہ جب اس کے سامنے پیش کی جاتی تھیں تو ان کو اس طرح قبول کرتی تھی جیسے کسی کا محب و عزیز بھائی کسی دور دراز مقام سے اسے میوے بھیجے اور وہ مزے لے لے کر کھائے، ایمان کی حلاوت بھی ایسی ہی ہوتی ہے جس کا تجربہ ہر مومن کو ہوتا ہے۔

اوپر ہم نے یہ جو کہا کہ عقل کی از خود رسائی ان تعلیمات تک نہیں ہو سکتی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ رسائی بالکل محال ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اسباب گمراہی کا ہر طرف دور دورہ ہوتا ہے اس لیے کہ دنیاوی زندگی پر مادی و حسی لذات و شہوات اور مصائب و آلام چھائے ہوتے ہیں، اور جس طرح آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ کرۂ زمین کو روشن کرتا ہے، اسی طرح ایک روحانی آسمان اپنے تاروں کے ذریعہ دلوں کو منور کرتا ہے۔

(۳)

جس طرح انبیاء کے دلوں میں قبول وحی کی استعداد ہوتی ہے، اسی طرح ہمارے دلوں میں انبیاء کی تعلیمات کو قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ استعداد دراصل وہ تیز حس ہوتی ہے جس کی اساس محبت اور ہمہ گیر شفقت اور مہربانی پر ہے۔ اسی سے دل دنیا کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے، نعمتوں کا فیضان کرنے والی ذات کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور انسانوں کے لیے شفقت و محبت کا پیکر بن جاتا ہے۔ کیونکہ اسے نعمتوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں شکر و احسان کے جذبات اس طرح امنڈ آتے ہیں جیسے چھاتی لبریز ہو جائے اور اس سے دودھ پھوٹ پڑے۔ یہی سبب ہے کہ فیاضی اور دریا دلی بلکہ انسانوں سے عشق سب سے زیادہ انبیاء کرام میں ہوتا ہے، اسی طرح ایمان لانے میں سبقت وہ لوگ کرتے ہیں جو سب سے زیادہ رحمدل

ہوتے ہیں۔ مومنین کی صفت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ نرم خو اور خاکسار ہوتے ہیں۔

(۴)

نبی اپنی دعوت میں اسی حس کو مرکز توجہ بناتا ہے، اور انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں پر جن سے کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور خود اپنی ذات پر غور کریں۔ نعمتوں پر یہ غور و فکر اس میثاق کا نقطۂ آغاز ہے جس کی بنیاد پر بندوں کا معبود سے رشتہ قائم ہوا ہے۔ اسی میثاق سے نبی کی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے، یہ میثاق نبی کے نزدیک واضح ترین حقیقت ہوتی ہے چنانچہ وہ اسے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ مسلمہ اصول کی طرح اسے بنیاد بنا کر اپنی دعوت شروع کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلُ	اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں
يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ	لاتے، درانحالیکہ رسول بھی تم کو تمہارے رب پر
اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے، اور وہ
(حدید: ۸)	تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو

اس آیت میں بجائے اس کے کہ دلیل سے ثابت کیا جاتا کہ کوئی عہد مخاطب سے لیا گیا تھا صرف اس کی خبر دی گئی اور فرمایا: "اگر تم مومن ہو"

اس کے بعد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ	وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات
اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ	نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ	روشنی کی طرف لائے اور بے شک اللہ تم
بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (حدید: ۹)	پر نہایت ہی شفیق اور مہربان ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی رأفت و رحمت کا ذکر کیا جو انھیں اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور فرمایا کہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں علم و معرفت کی روشنی میں لانا چاہتا ہے۔ یہاں اس کے علاوہ کوئی دلیل نہیں دی۔ البتہ میثاق کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ گویا جو شخص یہ محسوس نہ کرے کہ اس کا اپنے رب کے ساتھ کوئی عہد و پیمان ہے وہ اس لائق نہیں کہ اسے مخاطب کیا جائے، جیسے کوئی شخص مسلمہ اصولوں کا انکار کر دے، ظاہر ہے ہر علم کے کچھ مسلمہ اصول و مبادی ہوتے ہیں اور ان کو تسلیم کیے بغیر کوئی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

پھر اہل نور اور اہل ظلمت کے حال کی تصویر کشی کے بعد فرمایا:

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وہ وقت
تَخْشَعَ (ای تسھل وتلین)	نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا	حق نازل ہوا ہے اس کے لیے نرم ہو جائیں
نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ (الذی واضح	(جو بذات خود بالکل واضح ہے) اور ان لوگوں
بنفسہ) وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ	کی طرح نہ بن کے رہ جائیں جن کو اس سے
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ	پہلے کتاب دی گئی پس ان پر طویل مدت گزر
عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ	گئی۔ بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور
قُلُوْبُهُمْ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ	ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ یاد رکھو کہ اللہ
فٰسِقُوْنَ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ	زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے
یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	کے بعد۔ ہم نے تمہارے لیے اپنی آیات
قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ	واضح طور سے بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھ بوجھ
تَعْقِلُوْنَ ۝ (حدید: ۱۶-۱۷)	سے کام لو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کی ایک مثال پیش کی کہ جس طرح وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ لہلہا اٹھتی ہے اور خیر و برکت کا سامان بن جاتی ہے، اسی طرح وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا حال بیان کیا جو اللہ کی راہ میں انفاق اور بندگان خدا سے ہمدردی و مواسات کے صلہ میں روحانی زندگی اور نور سے بہرہ مند ہوئے۔ اس کے بعد دنیاوی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی جو اسباب ظلمت سے بھری ہوئی ہے اور فریب ہی فریب ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت کی وسعتوں کی طرف بلاتا ہے۔ فرمایا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا	جان لو کہ دنیا کی زندگی لہو و لعب، زینت و
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ	آرائش، فخر و مباہات اور زیادہ سے
بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ	زیادہ مال و اولاد حاصل کرنے کی حرص کا
وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ	نام ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے
الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ	بارش ہو اور اس کی لہلہاتی ہوئی فصل کفار
فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ	کو فریفتہ کر دے۔ پھر وہ خشک ہو جائے اور

حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ	تم اسے زرد دیکھو پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔
شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ	اور آخرت میں ایک عذاب شدید بھی ہے
رِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ	اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی
اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا	بھی اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔
اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ	تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ	ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت
وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ	آسمان و زمین کی وسعت کے مانند ہوگی۔
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ	وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ
فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ	اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝	اللہ کا فضل ہے۔ وہ اپنا فضل جس کو
(حدید: ۲۰-۲۱)	چاہے بخشے اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں استدلال میں ان امور کے سوا کچھ ذکر نہیں کیا جو بالکل ظاہر اور دلیل سے بے نیاز ہیں۔ یہی "ذکر" کا مفہوم ہے، اور اسی حقیقت کی تعبیر دوسری جگہ یوں کی گئی ہے:

وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا (نساء: ۶۳)

یعنی ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، اور ان قلبی احساسات کو بیدار کرے جو ان میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ نبی کا کام صرف "تذکیر" ہے اس کے بس میں یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے دلوں میں از سر نو کسی چیز کو وجود بخشے۔ وہ انھیں حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو پہلے سے ان کے دلوں میں موجود ہیں لیکن ان پر غفلت و نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ اس بات کی صراحت قرآن مجید نے بھی کی ہے اور انجیل نے بھی اور ارباب دانش نے بھی اس کا ادراک کیا ہے۔

(۵)

یہی حقیقت ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یوں بیان کیا ہے کہ حکمت کا نقطۂ آغاز خشیت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے شروع ہی میں فرمایا کہ وہ

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ: ۱) ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔

گویا جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں، شہوات میں متہمک ہے، دنیوی لذات

ہی اس کا مطمح نظر ہیں اس نے دین کی حس کھودی اور علم کے دروازے کو بند کر دیا۔ اس لیے اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں خشیت کی حس کو بیدار کریں۔ فرمایا:

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ (ابراہیم:۵) اور اللہ کے عبرتناک ایام کا ذکر کر کے انھیں نصیحت کرو۔

اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتابوں میں عذاب کا ذکر کثرت کیا ہے تاکہ لوگوں کے اندر خشیت بیدار ہو، اور علم الٰہی کے لیے استعداد پیدا ہو۔ یہ خشیت ایسی چیز نہیں کہ اس سے عقل پر حجاب پڑ جائے بلکہ وہ عقل کو فکر و نظر پر آمادہ کرتی ہے۔ کیونکہ جسے غفلت کے انجام بد کا خوف نہ ہو وہ کسی کام کے لیے سنجیدگی سے جدوجہد نہیں کر سکتا۔ یہ خشیت علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے کہ جس کے پاس علم نہیں ہوتا اسے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا جیسے اندھا جو کسی گڑھے کے کنارے کھڑا ہو، اسے کچھ خبر نہیں کہ اس کے آگے کیا ہے، چنانچہ اسے کچھ پروا نہیں یہاں تک کہ وہ اس میں گر پڑتا ہے۔ الغرض جس طرح دلوں میں فضائل اور بلندی کی طرف رغبت کی حس ہوتی ہے اسی طرح رذائل اور پستی سے خوف کی بھی حس ہوتی ہے۔ نبی اسی حس کو بیدار کرتا اور جلا دیتا ہے تاکہ وہ اس حق مبین اور نور ہدایت کو قبول کر سکیں جو ان کے سامنے وہ پیش کرتا ہے۔

(۶)

سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر اگر تم غور کرو گے تو اس سے دو باتیں واضح ہو کر سامنے آئیں گی:

اول یہ کہ انبیاء انسانوں کے سامنے واضح حقائق پیش کرتے ہیں، مگر اس طور پر کہ وہ انھیں فہم، بصیرت، یقین اور پورے اطمینان قلب سے قبول کریں۔

دوم یہ کہ وہ معجزے کا سہارا آخری علاج کے طور پر لیتے ہیں اور معجزہ کے مطالبہ سے انھیں رنج ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ معجزہ دلیل نہیں ہوا کرتا، اور جس شخص کے لیے حکیمانہ کلام اور حق مبین کارگر نہ ہو اس کے لیے معجزہ مفید ہو جائے اس کی توقع کم ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت مسیح علیہ السلام کو دیکھو کہ ان لوگوں پر کس طرح برہم ہوئے جنھوں نے ان سے معجزہ کا مطالبہ کیا۔ اور ان منافقین پر کس طرح اظہار افسوس کیا جو کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اسے تو پس پشت ڈال دیتے ہیں، اور معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ صالحین بغیر معجزہ کے ایمان لاتے ہیں۔

غرض وحی کا استدلال عقل وفہم کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کی تعریف کثرت سے آئی ہے۔ "تدبر" سے مراد فکر کو صحیح عقلی طریقہ پر استعمال کرنا ہے۔ "صحیح" اس لیے کہ ہر قوت کو غلط طریقہ سے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (معجزہ کی بحث دوسرے مقدمہ میں آئے گی)[1]

(۷)

ہم یہاں قرآن مجید کے طرز استدلال کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے استدلال کا طریقہ کیا ہے۔ کیوں کہ تم استدلال میں ان اصطلاحات کے عادی ہو چکے ہو جو بعد میں وضع کی گئی ہیں، مثلاً دلیل، دعویٰ، اثبات وابطال، قضیہ، صغریٰ وکبریٰ وغیرہ اور قرآن کے فطری اور سادہ طرز استدلال سے مانوس نہیں ہو۔

پہلی مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ	اے لوگو اگر تم کو دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہے۔

یہ تقریر دعویٰ ہے اس کے بعد دلیل ہے:

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (الحج: ۵)	تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ کے ایک قطرہ سے، پھر بستہ خون، پھر ایک لوتھڑے سے، کسی کی صورت گری ہوتی ہے، کسی کی سرے سے صورت گری نہیں ہوتی۔

اس کے بعد متنبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنا چاہتا ہے، فرمایا:

لِنُبَيِّنَ لَكُمْ	تاکہ ہم تمہارے سامنے واضح کر دیں۔

---

[1] قرآنی موضوعات پر مولانا کے بیشتر رسائل دراصل ان کے مقدمۂ تفسیر "فاتحہ نظام القرآن" کے مختلف اجزاء ہیں جنھیں مطالب کی وسعت کی بنا پر مستقل کتابوں کی صورت دیدی گئی۔ معجزات کی بحث کے لیے یہاں جس مقدمہ کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ فاتحہ نظام القرآن میں موجود نہیں ہے۔ البتہ اس موضوع پر مولانا کے خیالات ان کی کتاب "القائد الی عیون العقائد" مطبوعہ دائرہ حمیدیہ سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ (مترجم)

پھر یوم بعث کی تاخیر کی وجہ سے منکرین کو اس کے بارے میں جو شبہ ہوتا ہے اس کے ازالہ کے لیے دوسری دلیل پیش کی:

وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ	اور ہم رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں جسے
أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا	چاہتے ہیں ایک مدت معین کے لیے پھر
ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم	ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں۔
مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ	پھر تم کو کمال توانائی تک پہنچنے دیتے ہیں۔
إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ	اور تم میں سے بعض پہلے ہی مرجاتے ہیں
مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا	اور بعض بے بسی کی آخری حد کو پہنچتے ہیں
(حج: ۵)	اور یہ نوبت آجاتی ہے کہ وہ سب کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے اپنی خلقت کے لیے اوقات مقرر کیے ہیں، پھر جسے چاہتا ہے مقدم یا موخر کرتا ہے۔ اس میں وقوع قیامت کی بھی دلیل ہے کیونکہ ہر شر آمیز مخلوق کے لیے ایک متعین مدت مقرر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شر ہمیشہ باقی رہے گا اور وہ اعلیٰ خیر ظہور میں نہ آسکے گا جس کے لیے اس عالم کو بدیہی طور پر اس شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اس میں خیر و شر دونوں کا وجود ہے اس لیے اسے ایک روز ضرور ختم ہونا ہے۔

پھر بعث بعد الموت پر ایک اور دلیل پیش کی، فرمایا:

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا	اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ بے دم پڑی ہوئی
أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ	ہے اور جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں
وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ	تو اس میں جان آجاتی ہے اور ابھرتی ہے
زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝	اور طرح طرح کے خوشنما نباتات اگانے لگتی ہے۔

تفصیل سے دلیل بیان کرنے کے بعد کلام نے اجمال کا رخ اختیار کرلیا، فرمایا:

(۱) ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ (حج: ۶) یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔

چنانچہ وہ کسی چیز کو بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کرتا۔

(۲) وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ (حج: ۶) اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے

جیسا کہ اس نے تمہیں نطفہ سے پیدا کیا اور مردہ زمین کو زندہ کیا۔

(۳) وَاَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (حج:۶) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

کیونکہ حیات کو وجود بخشنا سب سے مشکل کام ہے۔ کوئی صنعت و قدرت اس سے بڑھ کر نہیں۔ اسی طرح کسی اور چیز پر تصرف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا موت پر۔ جس ذات کو موت پر تصرف کرنے کی قدرت حاصل ہو اور وہ زندگی بخشنے پر بھی قادر ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(۴) وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا (حج:۷) اور قیامت آکے رہے گی اس میں ذرا شبہ نہیں۔

جب تم نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے مختلف اوقات مقرر ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ وہ حق ہے چنانچہ کوئی کام عبث نہیں کرتا، اور یہ کہ وہ قادر مطلق ہے اور اس کے ہر عمل میں حکمت پنہاں ہے تو اب قیامت کے بارے میں شبہ کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

(۵) وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (حج:۸) اور اللہ ان سب کو زندہ کر کے اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

یہ گذشتہ باتوں کا آخری نتیجہ ہے۔

استدلال کا فطری طریقہ یہی ہے، لیکن چونکہ تم ایسی اصطلاحات کے عادی ہو چکے ہو جو عام گفتگو اور بول چال کے طریقہ سے ہٹی ہوئی ہیں اس لیے تمہیں یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ بات استدلال کے طور پر کہی جا رہی ہے۔ پس تمہیں بحث اور گفتگو کے صحیح اور فطری انداز کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

دوسری مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ ۝ (ملک:۱۲) بے شک جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے ہوئے ان کے لیے مغفرت اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔

یہ دعویٰ کی تقریر ہوئی۔ اس کے بعد دلیل بیان کی:

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ اور تم اپنی بات کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ وہ تو دلوں

اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (ملک:۱۳) کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔

یعنی جب وہ تمہارے ظاہر و باطن دونوں سے باخبر ہے تو کیوں کر تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں بدلہ نہ دے گا؟

پھر اس بات کی بھی دلیل دی کہ وہ دلوں کے رازوں سے باخبر ہے، فرمایا:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (ملک:۱۴) — کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے، وہ تو بڑا ہی باریک بیں اور حقیقت کی خبر رکھنے والا ہے۔

یہ ایک بدیہی دلیل ہے۔ اس لیے کہ خالق نے جو چیز اپنے ارادہ اور حکمت سے پیدا کی وہ اس کے بارے میں ضرور باخبر ہوگا۔ "خلق" محض اس کا نام نہیں کہ کچھ اجزا کو مرکب کر دیا جائے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مخلوق کے تمام گوشوں میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو "خلق" نہ کہیں گے۔ "وھو اللطیف الخبیر" میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ "لطیف" میں یہ پہلو ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتی۔ اور "خبیر" کا مفہوم یہ ہے کہ مخفی ترین چیز بھی اس کے دائرہ علم سے باہر نہیں ہوتی۔

تیسری مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۝ (ص ۲۶) — اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو۔

اس لیے کہ خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آقا کے طریقہ کی پیروی کرے۔ اس کی وضاحت یوں فرمائی:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (ص:۲۶) — اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کے راستہ سے ہٹا دے۔

یعنی حق کے راستہ سے

اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌۢ بِمَا — جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس وجہ سے کہ

نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص: ۲۶)	انھوں نے روزِ حساب کو بھلا دیا۔

اور اسی وجہ سے اتباعِ حق سے غفلت ہوئی۔ کیونکہ اس روز احقاقِ حق ہوگا، حکمِ الٰہی کا ظہور ہوگا اور بندوں سے اختیارات سلب کر لیے جائیں گے۔ جس شخص نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اس نے یہ گمان کیا کہ اس دنیا میں حق کی کارفرمائی نہیں ہے اور ہر طرف باطل ہی کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے فرمایا کہ اس عالم میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق ہی کی کارفرمائی ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ	اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان
وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ	کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں۔ یہ ان لوگوں
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا تو ان کافروں
مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ	کی بربادی کے لیے دوزخ ہے۔ کیا ہم ان
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل صالح کیا اور
كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ	ان کو جو دنیا میں فساد مچاتے ہیں یکساں کر دیں
نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (ص: ۲۷-۲۸)	گے؟ یا متقیوں اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے؟

اور یہ باطل ہے کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یا تو عاجز و بے بس ہے یا شر پر راضی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان دونوں باتوں سے بلند و برتر ہے۔ اس حصہ کو یہاں ذکر نہیں کیا کہ مذکورہ بالا باتوں سے خود واضح ہوتا ہے۔ پھر متنبہ کیا کہ یہ بات بطور استدلال کہی گئی ہے۔ فرمایا:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ	یہ ایسی کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے،
مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ	بابرکت ہے اس لیے ہے کہ لوگ اس کی
وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	آیات پر تدبر کریں اور صاحب عقل
(ص: ۲۹)	اس سے سبق حاصل کریں۔

اس طرح قرآن مجید اکثر اپنے دلائل پر متنبہ کرتا رہتا ہے۔

قرآن کے طریقِ استدلال کو سمجھنے کے لیے میرے خیال میں اتنی وضاحت کافی ہے۔